ناول ''دشتِ سوس'' کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ

☆ ڈاکٹر میاں مشتاق احمد،
استاد شعبہ اُردو، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور۔

یہ حسین بن منصور حلاج کی داستان حیات ہے جسے ناول کے سانچے میں ڈھالا گیا ہے یہ نام آج تک صوفیا و اولیا کے ناموں کے ساتھ لیا جاتا رہا ہے جو وجہ، نزاع ہے جو اسرار جہاں کا سوال ہے۔ یہ نام داستانِ میں روایت عشق کے لیے سرفہرست ہے اور اسرار مذہب میں سر جہاں بھی، عباسی خلافت کے بتدریج زوال پذیر عہد میں بڑے بڑے مدارس اور خانقاہیں علمی ادبی اور فلسفیانہ مباحث کی جگہیں تھیں، سوال کرنے والے، جواب کے لیے سرگرداں رہتے۔ خدا، کائنات اور انسان کی طاقتیں اور اس کی ممکنات زیر بحث آتے، نئے نئے فرقے قرب قیامت کی نشانیاں بتاتے اور قیامت کے منتظر رہتے۔ تاریخ اور تذکرے اس نام سے گونجتے ہیں۔ عباسی خلیفہ مقتدر کے دامن پر یہ داغ ہے کہ اس نے ایک عالم روحانی کو دار پر کھینچنے کا حکم دیا۔ حامد بن عباس وزیر مملکت نے برسوں منتظر رہنے کے بعد یہ اقدام کیا۔ جس کی زبان مرشد کے نہ ہونے اور تربیت کی کمی کی وجہ سے سارے راز اُگل دیتی ہے جو اس کی کثرت عبادات کی وجہ سے اس پر منکشف ہوئے۔ وہ اتنے بوجھ کو برداشت نہیں کر سکتا اور انالحق کہہ اٹھتا ہے۔ وجدان کی اس کیفیت کو ہوا دینے والے اس کے غلام اور دوسرے لوگ تھے مگر خود اس کے اندر اتنی بے تابی اور آتش شوق فروزاں ہے کہ وہ اس کے لیے جان کو کوئی حقیقت نہیں سمجھتا۔ زندگی سوزدروں سے عبارت ہوتی ہے۔ دار تو محض ایک بہانہ ہے

اس شوق کی لے کو تیز کرنے کا، وہ خود اس انجام کا متمنی و متلاشی ہے۔ خاتون اغول، اس کے لیے ایک ایسا مضراب ہے جس نے اس کے تار حیات کو چھیڑا، اور نغمے ابل پڑے ہیں وہ اس کی ذات بھی ہے اور ذات کے باہر کی کائنات بھی اور آخر وہی اس بڑے نغمے کو ایک عظیم غنائیہ بننے میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہے جمیلہ ہاشمی کہتی ہیں: حسین بن منصور حلاج کی زندگی کے المیے پر لکھنا ایک دن کی بات نہیں، ایک جست نہیں، یہ نام میں نے بچپن سے سنا تھا۔ سولی چڑھنے والے اس عالم ربانی کی ذات ہمیشہ مجھے فسانہ طراز، دل نشیں اور نہایت پر اسرار لگی ہے، حمیرہ اطہر کو انٹرویو دیتی ہوئی کہتی ہیں: دشت سوس لکھنے سے پہلے میں نے حسین بن منصور حلاج کے فلسفے اور اس دور کے علما کرام کے فلسفوں کا مطالعہ کیا، ان عوامل اور تضادات پر غور کیا جن سے منصور تختہ، دار تک پہنچا۔ دشت سوس لکھتے وقت میں نے اشرف علی تھانوی کی لکھی سیرت حلاج کو سامنے رکھا ہے اور تاریخ کے قدم بہ قدم چلنے کی کوشش کرتے ہوئے حسین بن منصور حلاج کی زندگی میں پیش آنے والے تمام نشیب و فراز کا احاطہ کیا ہے ان کرداروں میں، میں اتنا ڈوب گئی تھی کہ ان کے دکھ سکھ میرے دکھ سکھ بن گئے حسین بن منصور پر جو بھی گذری، میں نے اس کا عذاب بھی سہا ہے..... میں عمرہ کرنے گئی تو اپنے قلم کو رسولؐ کے روضہ کی جالی سے چھوا دیا آنے کے بعد مجھ سے اور کچھ نہیں لکھا گیا سوائے دشت سوس کے(۱)۔ دشت سوس کی تقریب رونمائی سے خطاب کرتے ہوئے جمیلہ ہاشمی نے سچ کی تلاش کے اس سفر کو یوں بیان کیا: میری متلاشی روح اور میرے بے محابا سوال مجھے کشاں کشاں حسین بن منصور تک لے گئے جہاں کام گارو با مراد روح کا انالحق گوجتا ہے۔ سفر کٹھن تھا اور روشنیوں کے اشارے سمجھنے کی صلاحیت مجھ میں نہ تھی سوائے محکم الدین سیرانی کی نظر کرم کے(۲)۔ یہ ناول ایک ایسے دور میں لکھا گیا ہے جب جمیلہ ہاشمی کی مذہب اور تصوف سے دل چسپی بہت بڑھ گئی وہ نماز پنجگانہ کے علاوہ وظائف میں مشغول رہا کرتی تھیں۔

جمیلہ ہاشمی نے ساری عمر عورت کو موضوع بنایا ہے۔ اس کا پہلا غیر مطبوعہ ناول وداع بہار، ایک عورت تاجور، کے احساسات و مسائل کا بیان ہے اس کی پہلی کہانی دو خط، مطبوعہ ۱۹۵۷ء ایک

عورت کا دکھ سناتی ہے اور آخری کہانی شیری مطبوعہ ۱۹۸۷ء بھی عورت ہی کی نفسی کیفیات کا بیان ہے۔ تین چار عشروں کو محیط اس تخلیقی سفر میں حسین واحد مرد ہے جو جمیلہ ہاشمی کی کسی کہانی کا مرکزی کردار بنتا ہے، محض اس لیے کہ جمیلہ ہاشمی کو حسین کی حق کی تلاش موہ لیتی ہے۔ جمیلہ کا یہ بیان کہ حسین بن منصور کا تذکرہ جس کی مماثلت قرۃ العین طاہرہ سے تھی، اسے بہا کر لے گیا اس استثناء کا جواز مہیا کرتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر سلیم اختر کے خیال میں: 'اگر چہ ناول میں وہ کئی طرح کے جذباتی کردار پیش کر چکی تھیں مگر حسین بن منصور حلاج کی تصویر کشی کا حق ادا کر دیا۔ محسوس ہوتا ہے کہ گویا اب تک کا تمام کام دشت سوس کے لیے ابتدائی تربیت تھا۔'' (۳) جمیلہ ہاشمی نے حلاج جیسی متنازعہ شخصیت کو ناول کے سانچے میں یوں ڈھالا کہ سینکڑوں برس کا فاصلہ طے کر کے وہ ہم کلام نظر آتا ہے۔

دشت سوس کے پلاٹ کی ترتیب ایسے انداز میں ہوئی کہ خود مصنفہ نے اسے غنائیہ کا نام دیا ہے۔ اس کے تین حصے ہیں صدائے ساز، نغمہ شوق، اور زمزمہ ء موت، پہلے حصے صدائے ساز، میں حسین کا دادا مجوسی، محمی، رقصاں درویشوں کی وجہ سے متجسس ہوتا ہے۔ جن کے نزدیک عشق مزرع زندگی ہے اس کی پگڈنڈیاں، ان کے لیے ہیں جو عاشقوں کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں یہ غیاب و حضور کی کیفیت میں سرشار رہتے، سجدے کے لیے جھکتے تو اٹھنے کا ہوش نہ رہتا آقائے رازی نے مجوسی محمی سے اس کا حساب لگوایا تو اس میں محمی کو خود اپنے گھر میں یہ کیفیت نظر آتی ہے۔ دشت سوس سے بیضا اپنے بیٹے منصور کے گھر، اپنے پوتے حسین سے مل کر اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمان ہو جائے گا تو وہ اس صدمے سے جانبر نہیں ہوسکتا۔ بستی میں ابتدائی تعلیم کے بعد حسین کے والد منصور نے اسے تستر کے مدرسے میں سہل بن عبداللہ تستری کے ہاں داخل کرا دیا۔ اپنی عمر کے اس حصے میں حسین انتہائی مضطرب نظر آتا ہے وہ حق کی تلاش میں اساتذہ سے الجھتا ہے اور سر عالم کا طالب ہے، سہل کے دار سے ڈرانے پر وہ تستر سے بھاگ نکلتا ہے اور بصرہ کے قافلے کے ساتھ چلتا ہے اس قافلے میں اس کی ملاقات نستوری کنیز اغول سے ہوتی ہے ڈاکوؤں کے حملے سے قافلہ بکھر جاتا ہے۔ حسین اغول کی یاد میں تڑپتا ہے۔ والد اسے ڈھونڈ کر پھر دوحرقہ کے درس میں شامل کر دیتا ہے جہاں

فن حرب کا درس بھی دیا جاتا ہے خلیفہ معتضد مدرسے کے معائنے کے موقع پر اپنی جوہر شناسی سے اسے دُربار کے لیے منتخب کر لیتا ہے یوں حسین دربار بغداد تک پہنچ جاتا ہے۔

دوسرے حصے نغمہء شوق میں حسین بیس سال کی عمر سے پہلے مادے کی زنجیریں توڑ ڈالتا ہے اور عدم وجود کا سفر غیر جانب داری سے کرنے کا آرزو مند بن جاتا ہے دربار سے کنارہ کش ہو جاتا ہے اور حضرت عثمان مکی کی درس گاہ میں شامل ہو جاتا ہے ان کے بھائی ابو ایوب اقطع کی بیٹی زینب سے نکاح ہو جاتا ہے جس کا چہرہ سوختہ مگر آواز اغول کی سی ہے۔ یہاں حسین، عثمان مکی کا گنج نامہ، نقل کر کے اسے برہم کر دیتا ہے تو وہ اسے دار کی بشارت دیتا ہے وہاں مدرسہ نظامیہ کے حضرت جنید بغدادی کے پاس جاتا ہے مگر وہ حسین کو گھر بھیج دیتے ہیں، جہاں روئی دھننے کی دکان کرتا ہے، دھنکی کا گیت، درپئے جاناں ہم رفت، اس کی روح میں سما جاتا ہے۔ کچھ دنوں بعد مکہ جانے والے قافلے کے ساتھ ہو لیتا ہے مکہ میں سوالی بن کر کہتا ہے: ''اے رب کعبہ مجھ پر منکشف ہو'' (۴) وہیں خاتون اغول سے ملاقات ہوتی ہے، تو حسین دیوانہ ہو جاتا ہے قافلے کے ساتھ واپس حضرت جنید بغدادی کے پاس آتا ہے جہاں سے باپ اسے گھر لے جاتا ہے۔ وہیں حامد بن عباس وزیر اور خاتون اغول کا بیٹا حسین، علاج کے لیے اس کے پاس لایا جاتا ہے حسین پھر مکہ بھاگ جاتا ہے وہاں اغول سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ مرجاتی ہے۔ کنیز گل رنگ کی زبانی وزیر کو اس آخری ملاقات کا علم ہوتا ہے تو غصے اور شکست کی وجہ سے حسین کو گرفتار کرالیتا ہے۔

تیسرے حصے زمزمہ موت، میں وہ انالحق کہتا ہے اور اس پر کفر کے فتوے لگتے ہیں دوبار اسے رہا کیا جاتا ہے لیکن علما و مشائخ وزیر حامد کی وجہ سے اس کے ارتداد کا فتویٰ جاری کر دیتے ہیں حامد بن عباس کہتا ہے'' میں اس کی انا کو قتل کروں گا (۵) حسین کو مثلہ کر کے دار پر چڑھایا جاتا ہے اور اسے جلا کر راکھ دجلہ میں بہادی جاتی ہے تو وہ بھی اناالحق پکارا اٹھتا ہے، یہاں جمیلہ ہاشمی نے بجا طور پر یہ سوال اٹھایا ہے کہ محمی کے پوتے اور منصور کے بیٹے حلاج کے لیے عشق مزرع، گلاب کیوں نہیں تھا۔ انور سدید ارنلڈ بینٹ کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں: ''تاریخی ناول میں تخلیق کار عملی طور پر

اس عہد کی تخلیق کرتا ہے جس میں اس نے زندگی گزاری۔ جمیلہ ہاشمی نے بھی حلاج کے عہد کو اپنی چشم تخیل کی معاونت سے حیات نو عطا کی ہے.....قاری ناول میں یکسر گم ہو جاتا ہے۔''(۶) دشت سوس ایک مضطرب اور سیماب آسا شخصیت کے کردار ایک مخصوص فکری تناظر میں ابھارتا ہے۔ اس ناول میں دو طرح کے موسم ہمارے سامنے آتے ہیں ایک موسم اپنا تلاطم سطح کے اوپر ظاہر کرتا ہے دوسرا اپنی یلغار بطون دل میں پیدا کر رہا ہے ان دونوں کا تصادم ناول کا مرکزی موضوع ہے۔

جمیلہ ہاشمی نے تاریخ کی متنازعہ فی شخصیت کو اس کے متصوفانہ زاویوں سے اجاگر کیا ہے اور اس کے اسرار میں قاری کو گہری دل چسپی لینے پر مائل کیا ہے انہوں نے تاریخ کے بطون سے ایک عمدہ ناول کا مواد حاصل کیا ہے اور اپنے دل کش مرصع اسلوب میں ایک ناول تخلیق کیا ہے جس میں تخیل کی مناسب پرواز کے لیے فضا کشادہ نہیں تھی۔ یہ ناول جمیلہ ہاشمی کے فن کا شاہکار ہے اس میں واقعات کے تمام دھاگوں کو فنی مہارت سے بنا اور انہیں قابل یقین انداز میں کہانی کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ جمیلہ ہاشمی دشت سوس کی واقعاتی ترتیب پر بات کرتے ہوئے کہتی ہیں تاریخ کے شواہد اور تذکروں میں لکھے واقعات بہت نہ ہونے کے باوجود میری رہنمائی کو کافی تھے بکھری ہوئی داستانیں، سینہ بہ سینہ دہرائے جانے والے سانحے اور سب سے بڑا حوالہ تو طواسین تھی جس کے مطالب سمجھنے کی کوشش میں نے اپنے طور پر برسوں کی، جو کچھ مجھ پر آشکار ہوا ہے اسے میں نے عباسی خلافت کے روبہ زوال منتشر تانے پر بن لیا۔(۷) دشت سوس کے دو معترضین حسن اختر ملک اور اسلم سراج الدین نے ناول پر تاریخ کے انحراف کا الزام لگایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ دشت سوس میں سیاسی اور معاشرتی رخ سے پہلو تہی کی گئی ہے۔(۸) جمیلہ ہاشمی نے ان الزامات کا جواب دیتے ہوئے کہا: ''میں ان الزامات کو نہیں مانتی، میں نے تاریخ مرتب کرنے کی کوشش نہیں کی یہ کام تاریخ نویسوں کا ہے میں نے ان کرداروں کو اپنے طور پر سمجھ کر لکھنے کی کوشش کی ہے جو انہیں میری طرح نہیں سمجھ سکے انہیں بے شک اختلافِ رائے کی آزادی ہے میں اتنا ضرور کہوں گی کہ میں نے تاریخ کو رد نہیں کیا (۱۹) اس اعتراض کے جواب میں کہ آپ نے ماضی کے کردار ہی کیوں تلاش کیے؟

جمیلہ ہاشمی نے جواب دیا: واقعات و حالات کو ادیب ایک رنگ میں دیکھتا ہے اور صحافی دوسرے رنگ میں، حالات کی فوری، منظر کشی ادب نہیں صحافت ہے جو شخص وقت کو نہیں سمجھتا وہ فن کار نہیں ہوتا میں تاریخ سے انہی کرداروں کا انتخاب کرتی ہوں جن کی آفاقیت نے مجھے متاثر کیا۔ آپ تاریخ کو ماضی کا قصہ سمجھیں میں اسے اپنے عہد کے تناظر میں دیکھنا چاہتی ہوں کیا اناالحق کہنے والے آج بھی پابند سلاسل نہیں کیے جاتے۔''(۱۰) دشت سوس کے پلاٹ پر ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا کہ اس میں جغرافیائی حالات کا خیال نہیں رکھا گیا۔ جن دنوں جمیلہ ہاشمی یہ ناول لکھ رہی تھیں تو تنویر ظہور کو انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے اس کا انداز تخلیق یوں بتایا: ''میں آج کل منصور حلاج پر ناول لکھ رہی ہوں۔ اس کے تین باب لکھے جا چکے ہیں، لکھتے وقت میں جغرافیہ سامنے رکھتی ہوں تا کہ جس جگہ اور شہر کا ذکر کروں اس کے صحیح فاصلے، مقام اور باقی معلومات لکھ سکوں۔ حلاج کے بارے میں تین چار سالوں سے مواد جمع کر رہی تھی جب تک اللہ کی رحمت شامل حال نہ ہو، لکھا نہیں جا سکتا''(۱۱) حمیرہ اطہر کو انٹرویو دیتے ہوئے کہتی ہیں: ''میں نے لکھتے ہوئے ان ممالک کے نقشے دیکھے، بغداد کا نقشہ میرے سامنے تھا، شہروں دریاؤں، پہاڑوں کا بغور مشاہدہ کیا ایران کا نقشہ چھ ماہ تک میرے کمرے میں لٹکا رہا''(۱۲) اس اعتراض کے متعلق کہ حلاج اور اس کے عہد کے بہت اہم سوالوں کو پس پشت ڈال دیا گیا سحاب قزلباش کو انہوں نے جواب دیا: ''زندگی میں سیاسی اور سماجی سوالوں سے بھی آگے کچھ سوال ہیں مگر عام آدمی کی سوچ سے یہ بالاتر ہیں''(۱۳) حسن اختر ملک کی رائے میں اغول کردار پلاٹ کی تباہی کا باعث بنا ہے اور اسلم سراج الدین کے مطابق اغول کا کردار فرضی ہے پلاٹ کو یہ رخ دینے سے ناول ایک عظیم تاریخی ناول کی بجائے حسن و عشق کا قصہ بن کر رہ گیا ہے۔ اس کے کردار تاریخی حقیقتوں سے منہ موڑتے نظر آتے ہیں، حامد بن عباس کی حسین سے دشمنی سیاسی اور مذہبی بنیادوں پر تھی مگر مصنفہ نے اسے جذبہ رقابت کا نتیجہ قرار دے دیا۔(۱۴) ڈاکٹر سلیم اختر نے ان اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے کہا: ''واضح رہے کہ فرید الدین عطار نے منصور حلاج کے عنوان سے جو مفصل مقالہ قلم بند کیا اس میں اشارتاً انہوں نے اس (اغول) کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

ایک مرتبہ اس نے جوانی میں کسی عورت کو دیکھا تھا۔ جمیلہ ہاشمی نے اغول کا کردار تخلیق کر کے حقیقت بلکہ زیادہ بہتر تو یہ کہ حق تک پہنچنے کی سیڑھی کا جواز بھی مہیا کر دیا ہے۔''(۱۵) اغول سے ناول نگار نے دو کام لیے ہیں ایک تو وہ حلاج کی شخصیت کو جذباتی اساس مہیا کرتی ہے، حسین ایک ہی جست میں مجاز کے مراحل طے کر گیا یہ الگ بات کہ اسے بہت عرصے بعد اس کا احساس ہوا اور دوسرے حامد بن عباس وزیر مملکت کی شدید دشمنی کے لیے جذباتی محرک مہیا کر دیا ہے۔ اغول کا اختراع کردہ کردار تاریخی حقائق سے منافی مان بھی لیا جائے تو بھی یہ ناول کی فضا کی جذباتی تشکیل کے لیے بے حد ضروری تھا ویسے بھی جمیلہ ہاشمی تاریخ کی کتاب نہیں لکھ رہی تھیں، وہ ناول لکھ رہی تھیں اور تاریخی ناول میں اس بات کی اجازت ہوتی ہے کہ کہانی میں دل کشی پیدا کرنے کیلئے کسی کردار کا اضافہ کر لیا جائے۔ سراج منیر اس مسئلے پر یوں روشنی ڈالتے ہیں: ''ان کرداروں کی حدود ہیں یعنی قرۃ العین طاہرہ جو بنیادی طور پر ایک جذباتی کردار ہے جب کہ منصور حلاج ایک روحانی بحران کا کردار ہے قرۃ العین طاہرہ کے کردار کے ساتھ روحانی سپرٹ (معاونت) موجود ہے جو اس کے بحران کو ظاہر کرتا ہے اور منصور حلاج کے ساتھ اغول کا کردار موجود ہے جو حسین کے جذباتی کردار کو سامنے لاتی ہے(۱۶) اس کے علاوہ حسن اختر ملک اور اسلم سراج الدین کے اعتراضات حامد اور قاضی القضا ابوعمر کے کرداروں پر بھی ہیں کہ وہ اتنے برے نہیں دکھائے گئے جتنے کہ وہ تھے بلکہ حامد کے ساتھ ہمدردی ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان اعتراضات کا جواب جمیلہ ہاشمی نے یوں دیا: ''اگر لوگوں کو حسین بن منصور حلاج کے متعلق رائے رکھنے کا حق ہے تو کیا مجھے نہیں ہے کیا مجھے اسے سمجھنے کا حق نہیں تھا؟.....میں محض تاریخ کی کتاب تو نہیں لکھ رہی تھی۔ اگر سلمان ندوی کو حسین بن منصور پر لکھنے کا حق تھا تو مجھے اختیار تھا کہ اپنے طور پر اس کی سوانح حیات لکھوں۔(۱۷)

اس تمام بحث سے جو نتیجہ سامنے آیا ہے وہ یہ کہ جمیلہ ہاشمی نے تاریخ نہیں ناول لکھا ہے اور فن کی دی ہوئی آزادی کو استعمال کر کے حسین کی سوانح کا روحانی، باطنی پہلو اپنے تمام ارتقائی مراحل سمیت دکھایا ہے۔ اغول کا نام اس کا تخلیق کردہ ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے ایسی فضا تخلیق کی ہے کہ

اس کی لحہ لحہ ڈھلتی اور آگے بڑھتی روحانی کیفیات کا نقشہ واضح ہو کر آنکھوں کے سامنے آیا ہے یوں تیسری صدی ہجری کا یہ کردار آج کے قاری کے سامنے پھر سے زندہ ہو جاتا ہے جو ایک فن کار کی کامیابی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ محمد علی صدیقی نے اس کا فیصلہ یوں کیا ہے کہ: ''وہ جس وصف کے لیے بطور خاص ممتاز رہیں گی وہ کرداروں کو ان کی مخصوص فضا میں آباد کرنے کی ایسی قوت ہے جو کرافٹ کی شرائط کے بغیر پوری نہیں کی جا سکتیں۔''(۱۸) ابن منصور کی شخصیت مجوث فیہ بن گئی تھی اس کردار کے گرد سریت کا دھندلکا موجود ہے اس اسرار نے ہی جمیلہ ہاشمی کو متاثر کیا اور انہوں نے ایک بڑے ناول کا بیڑا اٹھایا اس ضمن میں جمیلہ ہاشمی کا یہ بیان بھی قابل توجہ ہے کہ حلاج میں ماورا کو جاننے کی خواہش موجود تھی اس کے کردار میں پر اسراریت کے علاوہ التہاب بھی قدر مشترک کے طور پر موجود تھا اس کے دل میں جو آگ تھی اسے قاری اس شدت سے محسوس کرتا ہے چنانچہ دشت سوس پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ جمیلہ ہاشمی نے نہ صرف حلاج کی واردات کو خود اپنی ذات پر گذرتا محسوس کیا ہے بلکہ انہوں نے ایک اندھیرے غار میں جھانکنے کی کوشش کی ہے دشت سوس بنیادی طور پر کردار کا ناول ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے اس عہد کے کتابی مطالعے سے اس دور کی زندگی کے مختلف گوشے اور اس کی تعلیمات کے مختلف زاویے تاریخ کے اوراق سے تلاش کیے۔ تاہم یہ بات اہم ہے کہ ان سب کو ناول میں ڈھالتے وقت انہوں نے حلاج کی تعلیمات کو فروغ دینے کا فریضہ سرانجام نہیں دیا بلکہ اپنی تمام تر توجہ اس کردار کے اسرار کو اُجاگر کرنے، اس کے بارے میں موجود رائے عامہ کے مثبت اور متضاد رویوں کو ابھارنے اور حلاج کی روح کی یاترا کو تاریخی حقائق سے نمایاں کرنے میں صرف کی ہے۔ باالفاظ دیگر صلاح کی متذکرہ بالا حکایہ حیات کے اجمال کے گرد بقیہ تمام مصوری جمیلہ ہاشمی کے قلم اور خیال کا اعجاز ہے اور اس میں وہ ناکام نہیں ہوئیں۔ حلاج جیسی تہہ در تہہ شخصیت اور اس سے وابستہ تنازعات اتنے سہل نہیں کہ انہیں آسانی سے ناول کا موضوع بنایا جاسکے۔ کسی حقیقی شخصیت کو اس کی نفسیاتی پیچیدگیوں اور ان سے جنم لینے والے کرداری تضادات کو سانچے میں ڈھالنا اور اس طرح کہ ناول کے کینوس میں پورے تاریخی تناظر کے ساتھ سما جائے یہ

جمیلہ ہاشمی کا اعجاز فن ہے، حلاج کی باطنی کیفیات کی تصویر کشی کی ہے جمیلہ ہاشمی نے اس کے سر کٹانے کی والہانہ خواہش کو لفظ دیئے ہیں۔ حسین کے لیے تو عشق مزرع زندگی ہے عشق میں ہر شخص کے لیے جداگانہ رمز اور منفرد انداز ہوتے ہیں منصور حلاج حسب معمول اپنی خوشبو میں گم اور سب سے لاتعلق تھا حتی کہ نستوری کنیز اغول سے بھی اپنے آپ میں گم پانے کی جستجو میں، کچھ سمجھنے کی سعی میں، اس لیے جب اغول اس سے مخاطب ہوتی ہے، نہ حسین کو علم تھا اور نہ ہی اغول کو مگر یہ مشیت کا وہ منور لمحہ تھا جو ہونے نہ ہونے کی سرحد عبور کرا دیتا ہے۔ دونوں اس منکشف لمحے کی خوشبو کے زیر اثر عمر بھر سرشاری کی کیفیت میں رہے یہ تعلق جو تعلق روح بنا، یوں کہ ایک دوسرے سے ملے بغیر بھی واقف حال رہے۔ اگر مجاز حقیقت کی سیڑھی ہے تو حسین ایک ہی جست میں مجاز کے مراحل طے کر گیا۔ جمیلہ نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ حسین بے مرشد رہا تستر میں سہل بن عبداللہ، بصرہ میں عمر بن عثمان مکی، بغداد میں حضرت جنید کی صحبت میں رہا مگر کوئی بھی اس کی بے چین اور متجسس روح کی تشفی نہ کر سکا حلاج کیسا صوفی تھا کہ سوالات کرتا تھا جمیلہ ہاشمی نے بڑی محنت سے حسین کی بے چین روح کی تڑپ کے مختلف مدارج کی کامیاب تصویر کشی کی ہے۔ حسین کے اندر جو آتش فروزاں تھی اس کے وجود کو ایسے جلا رہی تھی جیسے لکڑی جلتی ہے اور جلتی رہتی ہے اسی لیے تو حضرت جنید اسے تنبیہہ کرتے ہیں، یہ سب اس کے وجود کو مدوجزر میں مبتلا رکھتا ہے حسین کی روح بے چین تھی ہم سبق اس سے کم تر تھے استاد اس کے لیے ناقص اور زاہد و پارسا صرف ظاہری دکھاوے تھے اسے روائتی درس کی ضرورت ہی کہاں تھی وہ تو اپنی ذات کے عشق میں گرفتار تھا۔ اسی لیے جب سسرا سے سمجھاتا ہے کہ مرشد کے بناٹھوکر لگتی ہے تو حلاج اسے جواب دے دیتا ہے۔ حلاج کی بے چین شخصیت کا بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ اسے جس آئینہ عزم کی جستجو تھی اور جس میں وہ اپنے وجود کا عکس دیکھنا چاہتا تھا وہ اس تلاش میں اب تک ناکام رہا تھا۔ اس کی ذات کا سفر انوکھا تھا وہ اپنی سائیکی کے نہاں خانوں میں اتر کر روشنی کے اس عظیم مخرج کا کھوج لگانا چاہتا تھا جو اس کے محور کی گھٹاؤں میں مخفی تھا۔ وہ معرفت کے سربستہ رازوں کا جویا تھا اس لیے اسے ''سیر الاسماء'' کا شوق تھا وہ اسم اعظم

جاننے کا خواہاں تھا اس نے بلا اجازت اپنے استاد عمرو بن عثمان مکی کا گنج نامہ چرا کر مطالعہ کرلیا اس کی مضطرب طبیعت بے چین روح اور سیمابی اعصاب طویل و پر پیچ مراحل سلوک کے لیے تیار نہ تھے وہ عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام۔ کا قائل تھا۔ اے ساربان آہستہ چل کہ میری پسلیوں میں آگ ہے۔''(۱۹) حلاج کے سوال سے بے عمل خانقاہی تصوف کی حقیقت کھل جاتی ہے۔ وہ باعمل صوفی دنیا والوں سے الگ ہونے کے برعکس ان سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ حاکموں سے ٹکراتا ہے باغی اور مفسدی قرار پاتا ہے فاتر العقل کہلاتا ہے حتی کہ اس عمل میں جان کی بازی لگا دیتا ہے۔ اور مقام سے گزر جانے کا متمنی ہے جبکہ لوگ اسے محض اپنی سطح پر دیکھنا چاہتے ہیں وہ حج کو جاتا ہے مگر اذنِ باریابی کا منتظر خانہ کعبہ میں داخل نہیں ہوتا لیکن یہ الٹے پھر آنے والوں سے بھی تو نہیں، کشف و کرامات اور سچائی سے اس روح کی تشفی نہیں ہوتی معتقدین اس میں الوہی صفات دیکھتے ہیں ہند میں اسے کرشن کا اوتار کہا جاتا ہے قازقستان والے حلاج الاسرار کہتے ہیں وہ طواسین کی صورت میں اپنے جذب و کشف کی حالتوں کو تحریر کرتا ہے جمیلہ ہاشمی نے انا الحق کے مسئلے کو وقت کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش تو نہیں کی البتہ بعض مواقع پر اس نے ایسے اشارے کیے ہیں''مقدر کا لکھا کیا ہے دادا؟ اس نے جھک کر قریب ہوتے ہوئے پوچھا۔ آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں وقت سب بھیدوں کو جاننے والا ہے اور انہیں کھولنے والا ہے تم اور میں اور ہم سب اور یہ ساری کائنات اسی کے تابع ہیں اور پھر بھی آدمی کبھی کبھار صدیوں میں ایک بار وقت سے آگے نکل جاتا ہے وقت پیچھے رہ جاتا ہے وقت اور آدمی آنکھ مچولی کھیلتے ہیں'' ''کیسے'' حسین نے محظوظ ہوتے ہوئے کہا کہیں دنیا کے کسی خطے میں کسی گوشے میں ایک آدمی پیدا ہوتا ہے جو اس وقت کے بہتے دھارے کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے'' سیاہ وش حسین سے زیادہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا دھارے کو روک دیتا ہے وقت تھم جاتا ہے۔''(۲۰) اس گفتگو کی کے ساتھ حضرت عثمان مکی کا یہ قول بھی شامل کر لیجئے تو بات کہاں تک جا پہنچتی ہے: ''یہ فنا ہونے والا وقت ہماری تقویم میں ہے ایک وقت اس سے باہر ہے جس سے ہم شناسا نہیں۔''(۲۱) حلاج اس وقت کا اسیر نہیں تھا وہ اپنے معاصرین کو صاحب اسرار نظر آتا ہے وہ

وقت کی جن جہات سے گزر رہا تھا ان کی منطق صرف عشق ہے جہت در جہت ہر دم بلند سے بلند تر ہوتی ہوئی بل کھاتی سیڑھیوں کی طرح اور اوپر ہی اوپر جانے والا، انہی باطنی کیفیات کے زیر اثر حلاج وقت کی سیڑھیاں طے کر گیا دیگر ایک دو چار درجہ بلند ہو سکے مگر حسین نے ان بلندیوں کو چھولیا جو حد انسان سے ماوراء ہے اس نے حق کی شمع کو منور دیکھا، دیوانہ وار بڑھا اور پروانہ وار نثار ہوگیا۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے بقول ''جمیلہ ہاشمی نے حلاج کی داخلی کیفیات جذباتی واردات اور اندرونی ہیجان کے ساتھ ساتھ بیرونی مناظر اور فطرت کو یوں ہم آہنگ کر دیا کہ خارج اور باطن ایک تال پر دھڑکتے محسوس ہوتے ہیں اگر چہ اپنے ناولوں میں وہ کئی طرح کے جذباتی کردار پیش کر چکی ہے مگر حسین بن منصور حلاج کی تصویر کشی کا حق ادا کر دیا بلکہ محسوس ہوتا ہے گویا اب تک کا تمام کام دشت سوس لکھنے کے لئے ابتدائی تربیت تھا۔''(۲۲)

جمیلہ ہاشمی نے مرکزی کردار کے مد مقابل حامد بن عباس وزیر مملکت کا پہلا تعارف کہانی کے دوسرے باب کے آغاز میں کرایا ہے جہاں حسین، خلیفہء وقت کا مقرب تھا تو حامد بھی اس کے ساتھ تھا دوسری جگہ اس کا تعارف امیر الامراء کی حیثیت سے کرایا گیا ہے جب وہ نبیذ کی محفل میں شریک ہے اور اس کی بیوی اغول کی موت کی خبر آتی ہے کنیزوں کے ذریعے اسے اپنی بیوی کی حسین کے ساتھ عقیدت کے تعلق کی خبر ہوئی تو حسین حلاج کو، جو گدڑی پوش تھا، گرفتار کرا لیا حسین سے مکالمہ ہوا تو اسے بندی خانے ڈال دیا آخر اس شرط پر رہائی دی کہ وہ بغداد چھوڑ دے دوسری دفعہ حامد کے سامنے حسین حلاج کی تحریر لائی گئی تو وزیر حامد نے اسے گرفتار کرا لیا اس کے خلاف سارے شواہد جمع کرائے ان دنوں حامد بن عباس کو اس کا بیٹا بھی، جس کا نام اغول نے حسین رکھا تھا چھوڑ کر چلا گیا تھا اور حامد شدید مایوسی کی حالت میں تھا۔ اس نے نہایت راز داری سے قاضی القضاء اور علماء کو اعتماد میں لیا اس وقت اس کا مقام و مرتبہ دربار شاہی میں بہت بلند تھا وہ جنوب کے محاذوں سے ناکام لوٹا تو جھنجھلا اٹھا، وہ حسین بن منصور کی عام لوگوں میں پذیرائی کا جان کر تڑپ اُٹھا۔ بالآخر حامد نے حلاج کے مقدمہ پر علماء سے فتویٰ حاصل کرلیا اور خلیفہ مقتدر سے اس پر مہر ثبت کرا کے حلاج کو

موت کے گھاٹ اتار دیا۔ حامد مرکزی کردار کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے اس کی دنیاوی جاہ کی ہوس زمانہء آغاز سے ہی واضح ہوکر سامنے آجاتی ہے۔ حسین سے اس کا حسد ابتدائی عہد دربار سے نشوونما پاتا ہے بظاہر وہ دربار میں بہت ترقی کر جاتا ہے لیکن اس کے گھر والے حسین کے طریق کو بہتر جانتے ہیں یہ امر حامد کی وحشتوں کو بڑھانے کے لیے مہمیز ثابت ہوتا ہے وہ تمام تر قوتوں سے مٹانے کے انتہائی اقدامات کراتا ہے۔ لیکن آخر میں دریائے دجلہ کی طغیانی و تباہی اس کی شکست کی علامت کے طور پر سامنے آتی ہے۔ اغول کا کردار ایک معاون کردار کے طور پر سامنے آیا ہے جو ایک طرف حسین حلاج کے سفر عشق میں مجاز کی سیڑھی کا کام کرتا ہے تو دوسری طرف مد مقابل کردار کے ساتھ حلاج کے الجھاؤ اور ٹکراؤ کا جواز بنتا ہے اس طرح یہ کردار پلاٹ کے تصادم میں شدت پیدا کرنے کا ذریعہ بنا ہے۔ اس کردار کے بارے میں ایک بحث یہ چل نکلی ہے کہ یہ ناول نگار کی سہل پسندی کا ثبوت ہے اور انعام سعید کے سامنے جمیلہ ہاشمی نے اس کا فرضی ہونا تسلیم کیا ہے۔ جبکہ ڈاکٹر سلیم اختر نے شیخ فرید الدین عطار کے بیان کو حوالہ بنا کر اس کی تاریخی حیثیت پر زور دیا ہے۔(۲۳) اور اس سے بھی زیادہ اہمیت نظر ثانی شدہ انا الحق کے مصنف، جیلانی کامران کی رائے کی ہے جنہوں نے دشت سوس کی پہلی تقریب رونمائی میں اس کردار کی تاریخی حیثیت ثابت کی۔(۲۴)

ناول میں چونکہ ابن منصور کی شخصیت کے ذاتی اور باطنی پہلو پر زیادہ زور دیا گیا ہے اس لیے دشت سوس میں منصور، محمی، آقائے رازی اور سیاہ وش بھی کرداری حیثیت کے حامل ہو جاتے ہیں لیکن ایک کرداری ناول میں ان کی حیثیت معاون کی ہے۔ علما کرام اپنا روایتی کردار ادا کرتے ہیں۔ مرشدین کرام ایک حد تک حلاج کی تربیت کرتے ہیں یوں دشت سوس کردار نگاری کے لحاظ سے ایک کامیاب ناول قرار پاتا ہے جمیلہ ہاشمی نے حلاج کے عہد کی تہذیبی زندگی پیش کرنے کے لیے طبقاتی کردار بھی بیان کیے۔ خلفاء سوداگر، مذہبی راہنما، کنیزین، غلام، مریدین، عزیز و اقربا سب اس زمانے کی زندگی پیش کرتے ہیں بقول ڈاکٹر سلیم اختر ''وہ اس مصور کی مانند ہے جو اپنی تصویر کو زندگی سے قریب تر کرنے ے لئے ہر طرح کے رنگ استعمال کرتا ہے مگر اس سلسلے میں جمیلہ ہاشمی

نے سب سے زیادہ جس چیز سے کام لیا ہے وہ اس کی (Emotional) جذباتی نثر ہے وہ ویسے بھی ایسی نثر لکھنے میں مہارت رکھتی ہے اور اپنے کرداروں کے جذباتی المیے اجاگر کرنے میں خصوصی کاوش کا ثبوت دیتی رہی ہیں چنانچہ ناول کی جذباتی فضا کی تشکیل میں اس کا یہ جذباتی اور قدرے معرب اسلوب خاصہ کارآمد ثابت ہوتا ہے۔''(۲۵)

ناول میں جمیلہ ہاشمی نے جن علاقوں کا ذکر کیا ہے وہاں کی معاشرتی زندگی، رہن سہن غرض تمام جزئیات کو ہماری آنکھوں کے سامنے پیش کر دیا ہے قاری خود بخود ناول کی فضا میں گم ہوتا چلا جاتا ہے۔ انتظار حسین کے مطابق ''دشت سوس کا ایک وصف یہ ہے کہ ایک عہد کو انہوں نے زندہ کر دیا ہے اسلامی تاریخ کا ایک دور سامنے گھومتا ہوا جیتا جاگتا دکھائی دیتا ہے۔''(۲۶) جو شخصیت غزل کا رسمی سا استعارہ ہو کر رہ گئی تھی دل و دماغ میں زندہ شخصیت کے طور پر ابھری۔ جمیلہ ہاشمی نہ صرف لفظوں کے مرقعے تیار کرتی ہیں بلکہ ان پر تنقید بھی کرتی چلی جاتی ہیں جس کا احساس قاری کو نہیں ہونے دیتیں ان کے ہاں خارج اور باطن ایک تال پر دھڑکتے ہیں اور قاری اس جذباتی فضاء سے مغلوب ہو کر رہ جاتا ہے اور قاری کے اعصاب اس اسلوب سے یوں ہم آہنگ ہو جاتے ہیں کہ اختتام پر وہ حسین کی تمام اذیتوں میں شریک ہو جاتا ہے۔ محمد علی صدیقی کے خیال میں ''قراۃ العین حیدر اور جمیلہ ہاشمی میں ایک بین فرق ہے دونوں رومانوی مخیلہ کی اسیر نظر آتی ہیں لیکن جمیلہ ہاشمی، قراۃ العین کے مقابلے میں زیادہ (Sensious) ہیں وہ علاقائی حسیت کے تحت اردو زبان کے ساتھ اپنے برتاؤ (Treatment) میں بڑی حد تک آزاد ہیں اگر ان کی کوئی ترکیب یا تمثال عام قارئین کی سمجھ سے بالاتر ہے تو وہ اس لیے کہ اس کا تعلق علاقائی یا بڑے تہذیبی دائرے اور وسطی ایشیاء پر محیط جغرافیائی حدود سے ہوتا ہے۔ خواجہ فرید کی کافیوں میں بھی ایک مخصوص حسیت کارفرما ہوتی ہے جمیلہ ہاشمی کے ہاں تجریدی خیالات جس انداز میں تفرید ہوتے ہیں وہ اپنے علاقائی سرمایہ احساس و اظہار پر کامل اعتماد سے ہی پیدا ہوا ہے۔''(۲۷) ناول اور نظریہ حیات کا چولی دامن کا ساتھ ہے جمیلہ ہاشمی نے اس عہد کو زندہ کیا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ اپنے نقطہ نظر کی وضاحت بھی

کی ہے تصویروں کا جال بچھانے کے ساتھ ساتھ ان واقعات پر تنقید بھی کی ہے قاری کو محسوس بھی نہیں ہوتا اور وہ درد جو جمیلہ ہاشمی کے دل میں موجود ہے، خود بخود قاری کے دل میں منتقل ہو جاتا ہے جو بڑے فن کا کمال ہے دشت سوس میں لکھتی ہیں ''کوئی معمار انگلیوں پر اس کا حساب شمار کر سکتا ہے کہ کتنے سر بنیادوں میں دفن ہوئے ہیں اور کون بتا سکتا ہے کہ چنائی میں استعمال ہونے والی اینٹیں جس مٹی سے بنائی گئی تھیں وہاں کتنے بدن پیوند خاک ہوئے ہیں۔''(۲۸) جمیلہ ہاشمی مقالات کی عکاسی بڑے کمال سے کرتی ہیں، کفایت لفظی اور جامعیت کا مظاہرہ کرتی ہیں ہندی اپنی تہذیب کا تعارف یوں کراتا ہے ''موسم شدید اور دل آویز ہوتے ہیں پاگل کر دینے والی دلفریب راتیں سیاہ اور ستاروں بھری اور ہماری عورتیں بھی شدید چاہت سے لبریز دل رکھتی ہیں پتی ورتا، شوہر کے ساتھ جل مرنے والی ایسی عورتیں سارے جہاں میں کہیں نہیں ہیں۔''(۲۹) چند جملوں میں برصغیر کی تہذیب کے اس پہلو کو اُجاگر کر دیا کہ شدید اور سخت رسوم و رواج کی ساری تہدید مظلوم عورت کے لیے ہے آغول کے ذکر میں ناول نگار نے عورت کی مظلومیت پر روشنی ڈالی ہے۔ امجد اسلام امجد بھی اس کو معرکے کی چیز قرار دیتے ہیں اس میں روحانی فضا کی عکاسی بڑی خوبی سے کی گئی ہے۔ حسین جن روحانی مراحل سے گذرتا ہے قاری ان تمام جذبات و احساسات کو اپنے دل میں محسوس کرتا ہے اسے یقین آجاتا ہے کہ واقعی روحانی تعلیم کے مدارج میں یہی دلی کیفیات ہوتی ہیں حلاج کی بے چینی و اضطراب ایک بھرے جام کی طرح چھلکنے کے قریب ہے بچھڑی روح کی بے قراری کو یوں ''کبھی کبھار یہ دل جو جل اٹھتا ہے جیسے خس و خاشاک کو شعلے کا قرب حاصل ہو جائے آخر یہ کیا ہے وہ کیوں آغول کو بھلا نہیں سکتا وہ سونے کے لیے لیٹتا تو سنہری بالوں کا دھارا جس میں زرد چاندنی گندھی ہوتی اس پر گرنے لگتا یہاں تک کہ وہ بحر ذخار کی طرح اسے ڈھانپ لیتا، موجیں اور لہریں اسے ایک تنکے کی طرح پٹختیں، اٹھاتیں، کبھی جھولا جھلاتیں''(۳۰) جمیلہ ہاشمی نے روحانی تجربے کے بیان کے لیے راہ سلوک کی اصطلاحیں ناول کی زبان میں شامل کی ہیں اور فلسفیانہ مباحث کو بڑی خوب صورتی سے ناول میں سمیٹا ہے روحانی کیفیات کی ترجمانی کے لیے جمیلہ ہاشمی عموماً اپنے اسلوب

میں صوفیانہ جذب و رقص کا آہنگ بیدار کر دیتی ہیں۔ ناول کے تینوں حصے صدائے ساز، نغمہ شوق، زمزمہ موت، اپنے اندر اصطلاحی مفہوم اور شاعرانہ رمزیت رکھتے ہیں یہ عنوانات جمیلہ ہاشمی نے اپنے تخلیقی مزاج اور احساسات کی مناسبت سے رکھے ہیں ان کا نغمہ و ساز جمیلہ کی نثر کو نیا رنگ دے رہا ہے جس میں نغمہ شامل ہے اور ایسا روپ دیا ہے جو ساز کی صدا سے دہک اٹھتا ہے جمیلہ ہاشمی کی نثر اپنی مدھر لے اور اپنے دھیمے سروں والی نغمگی سے مسحور کرتی ہے ان کے ہاں روکھی پھیکی حقیقت نگاری نہیں بلکہ نغمے میں رچی ہوئی نثر ہے جس میں شاعری کی روح نثر کے قالب میں اتر کر زندگی کی نوید دیتی ہے اور عشق کا احساس اور اس احساس سے پیدا ہونے والا شعور، مزرع گلاب بن کر ان پگڈنڈیوں پر لے جاتا ہے جہاں حلاج کی طرح عشق کی نشانیاں ملتی ہیں اور اس سے جمیلہ ہاشمی کی تخلیقی قوت کا اندازہ ہوتا ہے یہ نثر پڑھنے والے کو سرشاری کی کیفیت سے دوچار کرتی ہے ان کی نثر میں آہنگی اور نغمگی ہے اونچی لے میں نرم آواز رس گھولتی ہے اس میں تخیل سے جاندار تصویریں بنانے کی قوت موجود ہے یہ تخلیقی نثر ہے جمیلہ ہاشمی افسانوی نثر نگاروں کی جدید نسل میں اسی لیے امتیاز رکھتی ہیں۔ دشت سوس میں شاعرانہ لوازمات سے بھر پور کام لیا گیا ہے اس میں جگہ جگہ شعری احساس کو باقاعدہ نثری نظموں کا جامہ پہنایا گیا ہی خاص طور پر حسین (کردار) کی زبان سے اس کی روح کی ترنگ کو نظمیہ پن عطا ہوا ہے۔ ایسی کئی نظمیں دشت سوس میں جا بجا ملتی ہیں جو حسین (مرکزی کردار) کے جذباتی تلاطم کی مختلف کیفیات کو زبان دینے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ جمیلہ ہاشمی اکثر مرصع زبان استعمال کرتی ہیں اور بقول ڈاکٹر جاوید اختر ''جمیلہ ہاشمی نے اپنے فن پاروں میں کہیں کہیں نثری شاعری بھی کی ہے۔''(۳۱) وہ علامہ اقبال سے خوب استفادہ کرتی ہیں اور عموماً ان کے اشعار کو تشبیہاتی و استعاراتی نثر میں منتقل کرتی ہیں جمیلہ ہاشمی اپنی تخلیق کردہ آزاد نظموں کے ساتھ بعض مقامات پر کلاسیکی شاعری سے حوالہ دے کر منظوم تراجم پیش کر کے فضا کی شاعرانہ کیفیت کو جلا دیتی ہیں جمیلہ ہاشمی نے اس ناول میں رومانی فضا کو بھر پور طریقے سے اجاگر کیا ہے جس طرح وہ واقعات کا بیان کرتی ہیں وہ قاری کو ایک ماورائی دنیا میں پہنچا دیتا ہے جس پر رومانیت کی چادر تنی

ہوتی ہے لیکن باقی رومان نگاروں کی طرح قاری اس میں گم نہیں ہوتا بلکہ آ گہی پاتا ہے، اسے شعور ملتا ہے جو روح اور ذہن دونوں کو تقویت پہنچاتا ہے۔ جمیلہ ہاشمی کے قلم میں بڑی روانی ہے کہیں رکاوٹ یا اٹکاؤ نہیں، دریاؤں کی سی روانی ہے جو اپنے سامنے کی ہر چیز کو سمیٹ کر لے جاتا ہے جمیلہ کی اس خوبی کی تعریف نثار عزیز بٹ (۳۲) نے بھی کی ہے۔ روانی اور جوش کا عالم دیکھیے جس میں دھیمے سروں کی لے بھی شامل ہے، زیر و بم کی کیفیت بھی ہے، کبھی نغمے کی لے ہلکی ہو جاتی ہے اور کبھی اس میں جدت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ جمیلہ کے قلم کی خوبی ہے مرزا ادیب اس بارے میں کہتے ہیں ''اس ناول میں ان کے قلم نے ان کا بہت ساتھ دیا ہے ایک بہتے ہوئے دریا کی روانی ہے ان کا قلم قاری کو ساتھ لے کر چلتا ہی جاتا ہے کہیں رکتا نہیں۔'' (۳۳) جمیلہ کے بڑے معترضین بھی ان کی اس خوبی کو تسلیم کرتے ہیں حسن اختر ملک نے ان کے اسلوب کو واقعی حسین اور دل کش قرار دیا ہے ان کے انداز بیان کی خوب صورتی کی تعریف نہ کرنا بخل ہے نئی دلکش تشبیہات سے اپنی مہارت میں مینا کاری کرنا اور برجستہ و بے ساختہ جملوں سے حسن تحریر کا جادو جگانا انہیں خوب آتا ہے جمیلہ اپنی عبارت کو انتہائی نادر اور حقیقی تشبیہات سے مزین کرتی ہیں مثلاً ان جنگی کشتیوں میں سے آسمان کی طرف شدت دعا کی طرح اٹھتا پہلی رات کا چاند دریچے کی اوٹ سے لہراتا ریت میں دبے سکے کے کنارے کی طرح دکھائی دے رہا تھا'' (۳۴) دشت سوس کے اسلوب کی ایک بڑی خوبی اس کے مکالمات ہیں جس نے اس بھاری بھرکم موضوع کو کہانی کی شکل دینے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ دشت سوس کی کہانی حسین حلاج کی لحہ لحہ بدلتی نفسی کیفیات کی کہانی ہے جس کا بیان بڑی قدرتِ کلام کا متقاضی تھا اور پھر اس میں قصہ گوئی کے اوصاف شامل کر کے اس کو قابل مطالعہ بنانے میں دشت سوس کی مکالماتی زبان کا بڑا حصہ ہے اس میں ہمیں بشارتی انداز بھی ملتا ہے جو جدید دور کے افسانے کی ایک منفرد خوبی سمجھی گئی ہے جو خاص طور پر منشا یاد اور اس کے ہم نوا کہانی کاروں کے ہاں پایا جاتا ہے دشت سوس کی مکالمہ نگاری کہانی کے ارتقاء کا اہم اور بنیادی ذریعہ بنی ہے اغول کی کہانی محض ایک مکالماتی ٹکڑے میں کتنی جامعیت سے مرتب کر دی گئی ہے۔ دشت سوس کے وہ حصے جہاں

جمیلہ نے حسین حلاج کے، جواب قرآن پاک کے پیرائے میں مرتب کیے ہیں وہ اردو نثر کی مقفی و مسجع روایت کو آگے بڑھاتے ہیں مثلاً، ''وہ میری ثناء کرتا ہے اور میں اس کی اپنے علم سے، میں اس کی تخلیق کرتا ہوں اور ہم روایت پر اطلاع پاتے ہیں میں اس کی منتہا ہوں'' (۳۵) دشت سوس کی ایک اسلوبیاتی خوبی خود کلامی کا تجربہ بھی ہے جس کے ذریعے بہت سی ضروری معلومات اپنے اپنے موقع پر کردار کی زبان سے ڈرامے کے منظر کی طرح ادا ہو کر قاری تک پہنچ جاتی ہیں۔ دشت سوس کا اسلوبیاتی اعجاز اس کی منظر کشی میں بھی ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے ان مناظر کے ذریعے خارجی اور باطنی پہلوؤں کو اس طرح سمو دیا ہے کہ ایک دوسرے کی تعبیر معلوم ہوتے ہیں اس کی منظر نگاری نے ناول کے اسلوب کو جان عطا کی ہے یہ زندہ مناظر ناول کے مرکزی نقطہ نظر کو ابھارنے اور واضح کرنے کا اہم فریضہ انجام دیتے ہیں جمیلہ ہاشمی نے ان مناظر کی تشکیل سے خاص فضا بندی کا مقصد پورا کیا ہے تا کہ قاری ناول کے کرداروں کی نفسی کیفیات کو شدت سے محسوس کر سکے یہ ناول غنائیہ نثر کی عمدہ مثال ہے اس میں جمیلہ نے ایک نیا تجربہ کیا ہے یہ تجربہ صرف ادوار کے اعتبار سے یا واقعات کے اعتبار سے نہیں بلکہ زبان اور لہجے کے اعتبار سے بھی ہے خود جمیلہ ہاشمی کہتی ہیں ''میں جو کچھ لکھتی ہوں سوچ سمجھ کر لکھتی ہوں لکھنے سے پہلے سارے عوامل پر غور کر لیتی ہوں میں ایک ایک کو چیلنج کرتی ہوں کہ دشت سوس جیسی کوئی دس لائنیں لکھ کر دکھادے'' (۳۶) ستار طاہر کے مطابق یہ ان کا غرور نہ تھا بلکہ غرور فن تھا ''دشت سوس ایسا تخلیقی کارنامہ ہے جسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا اور اس کی خالق جمیلہ ہاشمی کو بھی'' (۳۷) غرض جمیلہ ہاشمی کا مقام دشت سوس کی وجہ سے اردو ادب میں ہمیشہ بلند رہے گا دشت سوس جمیلہ ہاشمی کی پہچان ہے۔ یہ کارنامہ انہیں ہمیشہ زندہ رکھے گا۔

حوالہ جات

۱۔ جمیلہ ہاشمی، استفسار از حمیرہ اطہر، مطبوعہ ہفت روزہ اخبار خواتین، کراچی، ۷ تا ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۷ء، ص ۲۰۔

۲۔ ایضاً، ص ۲۱۔

۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، مضمون ''جمیلہ ہاشمی رومان سے تصوف تک'' مشمولہ داستان اور ناول، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۱۴۵۔

۴۔ جمیلہ ہاشمی، دشت سوس، رائٹرز بک کلب، لاہور بار اول ۱۹۸۳ء، ص ۱۸۲۔

۵۔ ایضاً، ص ۱۲۱

۶۔ انور سدید، مضمون دشت سوس پر ایک نظر، روزنامہ جنگ، لاہور، ۲۴/ اکتوبر ۱۹۸۴ء، ص ۷۔

۷۔ جمیلہ ہاشمی، غیر مطبوعہ مضمون، دشت سوس کی تقریب رونمائی کراچی میں پڑھا گیا، عکس مملوکہ راقم، ص ۳۔

۸۔ اسلم سراج الدین، مضمون حسین دشت سوس میں، مطبوعہ ''فنون'' لاہور، شمارہ نمبر ۲۳، نومبر ۱۹۸۵ء، ص ۱۳۶۔

۹۔ جمیلہ ہاشمی، استفسار از حمیرہ اطہر، محولہ بالا، ص ۲۱۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۰۔

۱۱۔ جمیلہ ہاشمی، استفسار از تنویر ظہور، مطبوعہ روزنامہ جنگ، لاہور، ۲۶ مئی ۱۹۸۲ء، ص ۷۔

۱۲۔ جمیلہ ہاشمی، استفسار از حمیرہ اطہر محولہ بالا ۱، ص ۲۱۔

۱۳۔ جمیلہ ہاشمی، استفسار از سحاب قزلباش، مطبوعہ روزنامہ جنگ، لندن، ۲۷ ستمبر ۱۹۷۹، ص ۴

۱۴۔ اسلم سراج الدین، محولہ بالا ۸، ص ۱۴۱۔

۱۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، محولہ بالا ۳، ۱۴۹۔

۱۶۔ سراج منیر، مضمون ''جمیلہ ہاشمی'' مطبوعہ معاصر، لاہور، اگست ۱۹۸۳ء، ص ۱۱۳۔

۱۷۔ جمیلہ ہاشمی، استفسار از حمیرہ اطہر، محولہ بالا ۱، ص ۲۱۔

۱۸۔ محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، مضمون ''جمیلہ ہاشمی فن کے آئینے میں'' مطبوعہ نقوش، لاہور، شمارہ نمبر ۱۴۰، ص ۶۰۶۔

۱۹۔ جمیلہ ہاشمی، دشت سوس، محولہ بالا ۴، ص ۱۹۸۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۸۹۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۹۰۔

۲۲۔ سلیم اختر، محولہ بالا ۳، ص ۱۵۰۔

۲۳۔ اسلم سراج الدین، محولہ بالا ۸، ص ۱۴۱۔

۲۴۔ جیلانی کامران، مضمون مطبوعہ روزنامہ مشرق، لاہور، ۵ دسمبر ۱۹۸۳ء ص ۵۔

۲۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، محولہ بالا ۳، ص ۱۴۹۔

۲۶۔ انتظار حسین، کالم ''لاہور نامہ، روزنامہ مشرق، لاہور، ۵ دسمبر ۱۹۸۳ء، ص ۷۔

۲۷۔ محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، محولہ بالا ۱۸، ص ۶۰۵۔

۲۸۔ دشت سوس، محولہ بالا ۴/ص ۱۲۷۔

۲۹۔ ایضاً، ص ۲۶۷۔

۳۰۔ ایضاً، ص ۱۳۴۔

۳۱۔ جاوید اختر، ڈاکٹر، اردو کی ناول نگار خواتین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۱۵۰۔

۳۲۔ نثار عزیز بٹ، بحوالہ جمیلہ ہاشمی کی ناول نگاری از سمعیہ یاسمین، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم۔ اے اردو پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۸۸ء۔

۳۳۔ مرزا ادیب، بحوالہ ۳۲۔

۳۴۔ دشت سوس، محولہ بالا ۴، ص ۱۴۱۔

۳۵۔ ایضاً، ص ۳۵۵۔

۳۶۔ حمیراہ اطہر، محولہ بالا ۱، ص ۲۱۔

۳۷۔ ستار طاہر، چند یادیں چند تاثرات، رسالہ اردو ڈائجسٹ، لاہور، فروری ۱۹۸۸ء، ص ۲۲۲۔